۲۲/اکتوبر ۱۹۷۳ء

رجسٹرڈ نمبر ایل ۹۲۱
فون نمبر ۳۹

اسسٹنٹ ایڈیٹر

آل احمد سرور

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

قیمت سالانہ چھ روپے
فی کاپی بیس پیسے

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۲ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۴۰

آل احمد سرور

ڈاکٹر تارا چند

"ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

ڈاکٹر تارا چند کے انتقال سے ہندوستان ایک مایۂ ناز مورخ، ایک ممتاز ماہر تعلیم، ہندوستانی تہذیب کے ایک ستون اور اردو کے خاندان کے ایک بزرگ سے محروم ہو گیا۔ ڈاکٹر تارا چند میرے رشتے دار نہ تھے اگر وہ رشتے داروں سے بڑھ کر تھے۔ سر تیج بہادر سپرو کے بعد وہ تمام اردو دوستوں کے رہنما، فلسفی اور ہمدم تھے۔ انھوں نے پچاسی برس کی عمر پائی اور اس طویل عمر میں کائستھ پاٹھ شالا، الہ آباد یونیورسٹی، وزارت تعلیم، ایران میں ہندوستان کی سفارت، راج سبھا، نوعمری کی ادا اداوں اور کسی ایوانوں میں افکار و اقدار کی شمعیں جلائیں۔ وہ آخر تک نہایت باقاعدہ اور منظم زندگی گزارتے رہے، پڑھتے رہے، لکھتے رہے اور لکھنے پڑھنے والوں کو روشنی دیتے رہے۔ ہماری مشترک تہذیب کے ایسے عاشق اور عارف بہت کم ہوئے ہیں۔ ہماری صالح روایات کے ایسے علمبردار اور نئی فضا اور نئے مزاج کے لئے اپنی آغوش وا رکھنے والے ایسے جامع صفات آدمی اور بھی کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ وہ دلی والے تھے، مگر سارا ہندوستان اور پورا ہندوستان انھیں عزیز تھا۔ وہ ہندوستانی تھے مگر عالمی برادری پر بھی اُن کی نظر تھی۔ وہ مورخ بھی تھے اور ادیب بھی۔ چلاپتی راؤ نے ان کے انگریزی کے اسلوب کو وکٹورین کہا ہے مگر اس میں ایک عظمت تھی، ایک جلال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بلند آہنگ نغمہ آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا ہے یا پہاڑ سے کوئی آبشار گر رہا ہے۔ اُن کی اردو تحریر پر مغز اور شگفتہ ہوتی تھی۔ اس میں علم کی سنجیدگی اور ایک بیدار ذہن کی نکتہ سنجی تھی۔ وہ کسی جلسے میں ہوتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ ہماری تہذیب کی ساری وضعداری اور دلنوازی مجسم ہو گئی ہے۔ وہ بات کرتے تھے تو دھیما دھیما ہوتا تھا مگر بات بات میں حکمت جھلکتی تھی۔ ان سے مل کر اور ان کے شعلے سے چنگاری لے کر ہم جیسے چھوٹے لوگ اپنے اندر مقدس آتش کدوں کی آنچ محسوس کرنے لگتے تھے۔ افسوس ہے کہ دیوزادوں کی وہ نسل جس کے ڈاکٹر تارا چند ایک ممتاز فرد تھے، اب ختم ہوتی جا رہی ہے اور ہم بونوں میں گھر گئے ہیں۔

میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر تارا چند کو ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی اکیڈمی کے ایک جلسے میں الہ آباد میں دیکھا۔ وہ اکیڈمی کے سکریٹری تھے۔ میں نے اس جلسے میں ایک مضمون اقبال اور ابلیس کے عنوان سے پڑھا تھا۔

مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر تارا چند نے اس مضمون کی بڑی تعریف کی۔ سید سلیمان ندوی کچھ دیر سے آئے تھے میں آدھا مضمون پڑھ چکا تھا۔ بعد میں ان سے مضمون کے متعلق بات ہوئی تو ہنس کر کہنے لگے کہ آپ ابلیس کو خوب لتاڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر تارا چند نے کہا اور اقبال کو بھی۔

بعد میں میں نے ڈاکٹر تارا چند کی کتاب ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر پڑھی۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی جوانی کی تصنیف ہے مگر اس کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ جب پنڈت امرناتھ جھا نے اس صدی کی پانچویں دہائی کے شروع میں مولوی عبدالحق کے بعض بیانات سے چڑ کر اردو کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہیں جو ان جیسے عالم کو زیب نہیں دیتی تھیں تو ڈاکٹر تارا چند نے ان کا نہایت سکت جواب دیا۔ وہ گاندھی جی سے بہت متاثر تھے اور ہندوستانی سے متعلق گاندھی جی کے خیالات کو مقبول بنانے کے لئے انھوں نے بڑی کوشش کی۔ پنڈت امرناتھ جھا سے ان کا ہمیشہ اختلاف رہا مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اپنے بعد انھوں نے ہی ڈاکٹر تارا چند کو الہ آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنوایا یا ان کی خوبیوں کا معمولی اعتراف نہیں ہے۔ میں جب لکھنؤ سے علی گڑھ آیا تو ڈاکٹر تارا چند سے اکثر ملاقات ہونے لگی۔ وہ سال میں کئی بار علی گڑھ کا پھیرا کرتے تھے۔ پروفیسر حبیب سے ان کی بہت پرانی دوستی تھی اور وہ شعبۂ تاریخ کے بھی استادوں کے بزرگ تھے میری دعوت پر انھوں نے شعبۂ اردو میں کئی تقریریں کیں۔ یونیورسٹی کے توسیعی لکچروں کا انتظام جب میرے سپرد کیا گیا تو پہلا لکچر میں نے ڈاکٹر تارا چند کا کرایا۔ باوجود گوناگوں مصروفیات کے انھوں نے ہمیشہ میری دعوت قبول کی اور انجمن ترقی اردو ہند یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا شعبۂ اردو کے ہر کام میں مشورہ دیتے رہے اور مدد کرتے رہے۔ دہلی کی انجمن کی کل ہند کانفرنس میں جو ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی؟ وہ صدر تھے اور انھوں نے ایک بلیغ اور بصیرت افروز خطبہ پڑھا تھا جب زمانے میں وہ یونیورسٹی کی اکزیکٹو کونسل کے ممبر تھے اس زمانے میں، کونسل کے جلسوں میں وہ پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ وہ بحث کو ہمیشہ اونچی سطح پر لے جاتے تھے ذاتیات میں انھوں نے کبھی دخل نہیں دیا۔ انھیں کی تحریک پر لال قلعے میں یوم ظفر منایا گیا اور ایک ایسی یادگار تقریب ہوئی کہ جو کوئی اس میں شریک تھا وہ اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اس اجتماع میں ڈاکٹر تارا چند نے جب خطبہ پڑھا تو سبھی کو محسوس ہوا کہ آج ہم نے بہادر شاہ ظفر کے مقام اور منصب کو پہچانا ہے۔ اور جب جواہر لال نہرو نے کہا کہ کون کہتا ہے

مغل بادشاہ باہر کے تھے وہ ہمارے تھے اور ان کا ہماری مشترک تہذیب کے نکھارنے اور سنوارنے میں جو کارنامہ ہے اس پر ہم فخر کرتے ہیں تو ہر ایک نے جانا کہ یہ اس کے دل کی آواز ہے۔

ڈاکٹر تارا چند کی ساری تصانیف پر تبصرے کا یہ موقع نہیں۔ مگر انھوں نے چار جلدوں میں ہندوستان کی تحریک آزادی کی جو تاریخ لکھی ہے اس کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب اپنی جامعیت، تحقیق اور تنقید کی وجہ سے ایک کارنامہ ہے جس سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا اور جس کا حوالہ برابر دیا جائے گا وہ غالب کی زبان میں بجا طور پر کہہ سکتے ہیں۔

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ اس کتاب کی تیسری اور چوتھی جلدیں ابھی چند ماہ پہلے ہی شائع ہوئی تھیں۔ گویا ڈاکٹر تارا چند نے ملک و قوم سے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر کے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی زندگی میں ایک ایک کی سی وحدت ہے اور ان کے اس شاہکار میں ایک ایک کی سی عظمت۔ چند سال ہوئے ڈاکٹر تارا چند نے سر سید میموریل لکچروں کے سلسلے میں سیکولرزم پر دو لکچر انگریزی میں دیے تھے میں نے ان لکچروں کی بڑی تعریف کی اور خواہش ظاہر کی کہ ان کا اردو میں ترجمہ ہو جاتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ انھوں نے ازراہ شفقت مجھ سے کہا کہ میں ان کا ترجمہ کردوں۔ میں خود تو اپنی مصروفیات کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکا مگر ان سے یہ اجازت لے لی کہ اپنی نگرانی میں اپنے ایک رفیق سے ترجمہ کرا کے اسے انجمن ترقی اردو ہند سے شائع کرا دوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی اجازت دے دی تھی اور اب یہ لکچر انجمن کی طرف سے شائع ہونے والے ہیں۔ سیکولرزم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ڈاکٹر تارا چند نے جس طرح اسے تاریخ کا تقاضا اور ہندوستان کا مقدر ثابت کیا ہے وہ کوئی دوسرا نہ کر سکتا تھا۔

مجھے فخر ہے کہ ڈاکٹر تارا چند ہماری زبان کے اداریے باقاعدہ پڑھتے تھے اور اکثر انھوں نے ان کی تحسین کر کے میری ہمت افزائی کی۔ جب تک وہ دلی میں رہے انجمن کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ آخر میں الہ آباد کے قیام میں وہ سفر میں احتیاط کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اس لئے صرف اپنا خط بھیج دیتے تھے۔ گذشتہ سال جب پروفیسر حبیب کے انتقال کے بعد وہ علی گڑھ آئے تو غریب خانے پر بھی قدم رنجہ فرمایا۔ کیا خبر تھی کہ ان سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔

ڈاکٹر تارا چند کی زندگی بڑی بھرپور اور شاداب زندگی تھی۔ وہ ہندوستانی تہذیب اور تاریخ کی ہر ادا کے رمز شناس تھے

باقی صفحہ ۵ کالم ۳ پر

سہیل محمود نقوی

دہلی میں اردو — ایک جائزہ

دہلی میں اردو — اس موضوع پر گزشتہ چند برسوں کے دوران بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ اردو روزناموں میں الجمعیۃ و دعوت کے علاوہ انگریزی روزنامے ہندوستان ٹائمز اور پیٹریاٹ میں بھی کثیر انگریزی مضامین و مراسلات شائع ہوئے ہیں۔ ہفت روزہ اخبارات میں ہماری زبان، حیات، بلٹز اور ایشیا سرفہرست ہیں جنھوں نے کئی توجہ طلب مضامین شائع کئے ہیں اور سب میں آخری اضافہ ماہنامہ آجکل کا اردو نمبر ہے جس میں اسی موضوع پر خاصا طویل مضمون پیش کیا گیا ہے۔ مگر آخری اضافہ ہونے کے باوجود اس میں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے جن کی بجا طور پر توقع کی جاتی تھی۔ دہلی کے مختلف انتظامی اداروں (دہلی ایڈمنسٹریشن، دہلی میونسپل کارپوریشن، نئی دہلی میونسپل کمیٹی اور دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی) میں اردو کی صورت حال کیا ہے۔ ان میں اردو کے کام کاج کے لئے کتنا عملہ مقرر کیا گیا ہے، وہ کافی ہے یا ناکافی، ان اداروں کے خبرنامے، اطلاعات و اشتہارات اردو میں بھی شائع ہوتے ہیں یا نہیں، ان کے ترجمے کا معیار کیا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہندی زبان کو محض اردو رسم الخط میں لکھ کر کام چلا لیا جاتا ہو۔ ان اہم پہلوؤں کا کوئی جائزہ اس مضمون میں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ۱۹۵۵ء میں دہلی کے چیف کمشنر کی طرف سے بنائی گئی لسانی مشاورتی کمیٹی کی سفارشات، بھارت سرکار کے ۱۹۵۸ء کے ایگزیکٹیو اسٹیٹمنٹ کی ہدایات اور ان پر عمل درآمد اور دہلی کارپوریشن کی اردو کو ثانوی زبان منظور کرنے کی ۱۹۶۲ء کی قرارداد کا بھی کوئی تذکرہ موجود نہیں۔ دہلی میں اردو کی حیثیت کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے کاغذی طور پر کیا کیا مراعات دی گئی ہیں اور عملی طور پر کتنی محرومیاں مقدر بن گئی ہیں۔ یہ بڑی اہم اور بنیادی باتیں ہیں جن سے صرف نظر انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ زیر نظر مضمون میں اردو کی ضرورتوں سے متعلق جو چند سطری تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ بھی نہایت مختصر اور سرسری ہیں جبکہ یہی پہلو زیادہ تفصیل اور توجہ کے مستحق تھے۔

۱۸ مئی ۱۹۵۵ء کو دہلی کے چیف کمشنر نے ایک لسانی مشاورتی کمیٹی مقرر کی تھی جس کے صدر ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ (ریاستی وزیر صحت) تھے۔ اس کمیٹی نے ۲۷ اگست ۱۹۵۶ء کو اپنی رپورٹ پیش کی جس میں اتفاق رائے سے ہندی کو دہلی کی سرکاری زبان اور عوامی مقاصد کے لئے اردو کو علاقائی زبان تسلیم کئے جانے کی سفارش کی گئی تھی۔ یہ رپورٹ تقریباً دو سال تک بھارت سرکار کے زیر غور رہی اور ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو وزارت داخلہ کی طرف سے ایک ایگزیکٹیو اسٹیٹمنٹ جاری کیا گیا جس میں ریاستی حکومتوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اردو میں تعلیم و امتحانات، اساتذہ کی تربیت، مناسب درسی کتابوں کی فراہمی، عدالتوں و دفتروں میں اردو درخواستوں، دستاویزوں کو قبول کئے جانے اور اہم قواعد و قوانین اردو میں بھی جاری کئے جانے کی سہولتیں فراہم کریں۔ ۳۰ جولائی ۱۹۵۸ء کو وزارت داخلہ کے جوائنٹ سکریٹری نے دہلی کے چیف کمشنر کو ایک نیم سرکاری خط بھیج کر یہ تاکید بھی کی کہ دہلی میں ایگزیکٹیو اسٹیٹمنٹ کی ہدایتوں پر سختی سے عمل درآمد کیا جانا چاہئے۔ مگر دہلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی مناسب کارروائی نہ کی گئی۔ ہاں دہلی میونسپل کارپوریشن نے اگست ۱۹۵۸ء ہی میں ایک اردو کمیٹی مقرر کی جس نے جنوری ۱۹۶۱ء میں ان سفارشوں کے ساتھ اپنی رپورٹ پیش کی کہ ناموں کی تختیاں اور بورڈ اردو میں بھی لگائے جائیں، کارپوریشن کے تمام فارموں میں ہندی کے ساتھ اردو کو بھی شامل کیا جائے، اردو کے خطوط کا جواب اردو میں ہی دیا جائے، پبلک نوٹس، اخباری اشتہارات اور پریس نوٹ اردو میں بھی جاری کئے جائیں۔ چنانچہ ان سفارشوں پر عملی طور پر کارروائی کی جانے لگی اور ۳۱ جنوری ۱۹۶۲ء کو قرارداد نمبر ۹۲۳ کے ذریعے کارپوریشن نے انھیں منظور بھی کر لیا۔ لیکن دہلی ایڈمنسٹریشن میں مسلسل دس سال تک جمود طاری رہا اور بار بار احتجاجات و مطالبات کے بعد ۱۹۶۸ء میں ایک دو نفری اردو سیل قائم کیا گیا جو عملی طور پر ناکافی اور ناکارہ ہی ثابت ہوا جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ دہلی

ایڈمنسٹریشن کی طرف سے آج تک کسی بھی قاعدے یا قانون کا اردو ترجمہ پیش نہیں کیا گیا اور نہ ہی گزشتہ ۱۵ برسوں کے دوران کسی نصابی کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا۔ جو نصابی کتابیں اردو میں دستیاب ہیں ان کے ترجمے و اشاعت کا سہرا پہلے صرف مکتبہ جامعہ کے سر تھا اور اب ترقی اردو بورڈ بھی اس کمی کو دور کرنے میں مصروف ہے۔

زیر نظر مضمون میں تعلیمی اعداد و شمار لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی بارھویں رپورٹ (برائے جولائی ۱۹۶۹ء تا جون ۱۹۷۰ء) سے لئے گئے ہیں جس میں بیشتر تفصیلات ۶۹-۱۹۶۸ء کے تعلیمی سال تک ہی کی درج کی گئی ہیں۔ اس طرح "آجکل" کے اس اردو نمبر میں چار سال پرانے اعداد و شمار پیش کرکے کام چلایا گیا ہے جبکہ ذرا سی تگ و دو سے گزشتہ سال (۷۲-۱۹۷۱ء) تک کے اعداد و شمار حاصل کر لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ چنانچہ ۷۲-۱۹۷۱ء میں پرائمری سطح پر اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد ۱۴۴، معلموں کی تعداد ۲۸۸ اور طلبہ کی تعداد ۱۶۹۳۳ ہو گئی جبکہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں اسکول ۴۴، معلم ۲۶۹ اور طلبہ ۱۰۲۷۴ ہی تھے۔ ان اعداد و شمار کے تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تین سال میں اسکولوں کی تعداد میں ۱۰۰ (تقریباً تین گنا) اور طلبہ کی تعداد میں ۶۶۵۹ (دوگنا) کا اضافہ ہوا لیکن معلموں کی تعداد میں محض ۱۹ ہی کا اضافہ کیا گیا جبکہ طلبہ اور اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کو دیکھتے ہوئے کم از کم ڈھائی سو معلموں کا مزید تقرر کیا جانا چاہئے تھا۔ معلموں کی اس کمی کے باعث اردو میڈیم اسکول اور طلبہ کتنی محرومیوں کا شکار ہوں گے اس کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اس تجزیہ سے یہ عوامی شکایت بھی ناقابل تردید طور پر سچ ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں غیر اردو داں ٹیچر تعینات کر دئے جاتے ہیں۔

اسی طرح ۶۹-۱۹۶۸ء میں اردو میڈیم سکنڈری اسکولوں کی تعداد ۹ تھی جن میں ۴۶۴۹ طلبہ تعلیم پا رہے تھے اور ۱۴۳ معلم درس و تدریس کا فرض انجام دے رہے تھے۔ ۷۲-۱۹۷۱ء میں یہ تعداد بالترتیب ۲۲، ۷۷۰۸ اور ۲۴۲ ہو گئی۔ یہاں بھی اسکولوں اور طالب علموں میں اضافے کے تناسب سے معلموں کی تعداد بڑھائی نہیں گئی ہے جو قابل افسوس ہی نہیں بلکہ قابل مذمت بھی ہے۔

محکمۂ تعلیم کی طرح دہلی ایڈمنسٹریشن کا محکمۂ اطلاعات بھی اردو کو اس کے جائز حقوق سے محروم کئے ہوئے ہے۔ اس محکمہ میں اردو کے کام کاج کی تکمیل کے لئے پہلے ایک اردو ٹرانسلیٹر اور ایک اردو ٹائپسٹ کی پوسٹیں تھیں جنہیں گزشتہ کچھ برسوں کے دوران ختم کر دیا گیا۔ کئی سال کے لگاتار مطالبات کے بعد اردو ٹرانسلیٹر کی پوسٹ دوبارہ قائم کر دی گئی مگر اردو ٹائپسٹ کی پوسٹ کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اسی محکمۂ اطلاعات کی طرف سے دہلی ایڈمنسٹریشن کا جو ماہوار رسالہ "دہلی" شائع ہوتا ہے وہ صرف ہندی میں جبکہ یہی رسالہ پہلے سہ ماہی تھا اور ہندی انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی شائع کیا جاتا تھا۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ مغربی بنگال اور ہریانہ کی حکومتیں تو اپنے رسائل "پندرہ روزہ مغربی بنگال" اور "تعمیر ہریانہ" کے نام سے اردو میں بھی شائع کریں لیکن دہلی جہاں اردو کی نشوونما ہوئی، جہاں کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کے ارتقاء میں اس نے اہم رول ادا کیا وہیں اس کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافیاں برتی جائیں۔

دہلی میونسپل کارپوریشن میں اگرچہ ایک مکمل ٹرانسلیشن سیکشن موجود ہے مگر اردو کے استعمال میں زوال پذیری نمایاں ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ برسر اقتدار جماعت کا رویہ ہو۔ چنانچہ کارپوریشن کی طرف سے غیر ملکی معززین کو جو استقبالیہ دئے جاتے ہیں ان میں اب عام طور پر سپاس نامے کے بجائے اردو رسم خط میں بھی "ابھینندن پتر" ہی پیش کرایا جاتا ہے۔ اسی طرح کارپوریشن کے علاقوں میں اب سڑکوں، بس اسٹینڈوں وغیرہ کے نام اکثر اردو میں نظر نہیں آتے اور جہاں ہوتے بھی ہیں وہاں املا اور کتابت کی غلطیاں ہونا کچھ ضروری سا ہے۔ جبکہ اس ضمن میں نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے علاقوں میں گزشتہ دو برسوں کے دوران خاطر خواہ سدھار ہوا ہے۔ حال ہی میں نئی دہلی میونسپل کمیٹی میں اردو ترجمے کے کام

کالج کے لئے ایک اردو ٹرانسلیٹر کی پوسٹ بھی منظور کی گئی ہے اور یقیناً ایک خوش آئند اقدام ہے۔ دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں بھی ایک اردو ٹرانسلیٹر کی پوسٹ ہے مگر اس کے باوجود وہاں سے جو اشتہارات و اعلانات اردو اخباروں میں شائع ہوتے ہیں ان میں انگریزی ہندی کا غلبہ رہتا ہے۔

دہلی مرکزی علاقے میں اردو کے ساتھ یہ ناروا سلوک ہمارے جمہوری اقدار کے لئے باعث ننگ ہے۔ اردو سے متعلق مراعات کو قرار واقعی عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دہلی کے مذکورہ بالا سبھی انتظامی اداروں میں خصوصی افسروں کا تقرر کیا جائے۔ محض ایک ٹرانسلیٹر کی تقرری اشک شوئی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ جس طرح ان سبھی انتظامی اداروں میں ہندی کے کام کاج کی نگرانی کے لئے متعدد صاحب اختیار ہندی افسر مقرر ہیں اسی طرح ایک ایک اردو افسر بھی مقرر کیا جانا چاہئے جو لینگویج اسسٹنٹ کی تمام ہدایتوں کو پورا کرنے کے لئے ذمہ دار ہو۔ اسی کے ساتھ لینگویج اسٹیٹمنٹ کو قانونی شکل دی جانی چاہئے تاکہ عدالتوں اور جائداد وغیرہ کی رجسٹری کے معاملات میں اردو درخواستیں اور دستاویزیں قبول کئے جانے سے جو انکار کیا جاتا ہے اس پر بندش عائد ہوسکے۔ سبھی انتظامی اداروں میں کلرکوں کی بھرتی کے قواعد میں ترمیم کرکے اردو جاننے کی شرط کو لازمی قرار دیا جانا چاہئے۔ اس بات کی بھی شدید ضرورت ہے کہ ہائر سکنڈری سطح پر بھی اردو میں درس و تدریس اور امتحان میں بطور میڈیم اردو اختیار کرنے کی سہولت دی جائے کیونکہ اس کمی کے باعث سکنڈری سطح پر اردو میڈیم اختیار کرنے والے طلبہ کو آئندہ تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ان سب کوتاہیوں اور محرومیوں کے باوجود اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ دہلی میں اردو کو سبھی سہولتیں دی جارہی ہیں اور بھارت سرکار کے لینگویج اسٹیٹمنٹ پر اطمینان بخش طور سے عمل کیا جارہا ہے تو یہ صرف بے بنیاد ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہوگا۔

سرکاری طور پر مذکورہ بالا اقدامات کئے جانے کے علاوہ اردو تنظیموں اور اردو دوستوں کو بھی باہمی اشتراک سے کچھ ٹھوس کام انجام دینے کی اشد ضرورت ہے۔ عام طور پر غیر اردو داں طبقے میں بہت سے لوگ اردو سیکھنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں مگر مناسب سہولتوں کی عدم فراہمی کے باعث ان کا شوق پورا نہیں ہو پاتا۔ اگرچہ جامعہ ملیہ کے خط و کتابت اردو کورس سے کچھ تلافی ہوتی ہے مگر مراسلاتی تعلیم بھی کبھی براہ راست تعلیم کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دہلی کے مختلف علاقوں میں مفت اردو تعلیم کے کچھ مراکز قائم کئے جائیں جہاں بالغوں اور نابالغوں دونوں ہی کو اردو سکھانے کا انتظام ہو۔

دوسری توجہ طلب بات نئی نسل میں خوشنویسی کی طرف رجحان پیدا کرنے کے لئے کچھ ترغیبات کی فراہمی ہے۔ اس کے لئے مناسب یہ ہوگا کہ جس طرح غالب اکیڈمی میں اردو ٹائپ کا تربیتی کورس شروع کیا گیا ہے اسی طرح کسی ادارے کو اردو خوشنویسی تربیتی کورس بھی شروع کرنا چاہئے تاکہ اچھے کاتبوں کی بڑھتی ہوئی کمی کو دور کیا جاسکے۔

(بقیہ صفحہ ... سے آگے)

انھوں نے کتنوں کو تاریخ بھی سکھائی اور تہذیب بھی اور ایک بامقصد اور بامعنی زندگی کے آداب بھی۔ وہ قدیم و جدید کا سنگم تھے جن قدروں کی انھوں نے ساری عمر علمبرداری کی ان کی نگہداری اور نگہبانی ہمارا مقدس فریضہ ہے۔ دیکھنا ہے کہ ہم اس عظیم انسان، اس عالم باعمل، اس سچے اور پکے ہندوستانی اور مشرقی تہذیب کے اس روشن مینار کے نقش قدم پر چلنے اور اس کے مشن کو آگے بڑھانے کا کتنا دم رکھتے ہیں۔

مراسلات

اردو یونیورسٹی

موقر ہفتہ وار "ہماری زبان" بابت ۸ر اکتوبر میں اردو یونیورسٹی کے بارے میں میرے مراسلے کے جواب میں محترم عباسی صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے، اس کے آخر میں موصوف نے لکھا ہے:

"...... فضا بدل رہی ہے، وقت آئے گا کہ اردو کو اس کا جائز مقام ملے گا اور حکومت اردو یونیورسٹی قائم کرے گی ...... اردو یونیورسٹی ضرور بنے گی اور حکومت بنائے گی۔ ہمارا مطالبہ جائز اور مبنی بر حق ہے، ناکامیابی کی کوئی وجہ نہیں۔"

اسے دعا کہیے یا دلی تمنا یا محض خود فریبی، جو کچھ بھی ہو، میں بھی محترم عباسی صاحب کے ساتھ شریک ہوں۔ اردو یونیورسٹی کا میں بھی حامی ہوں اور سو فیصدی، چاہتا ہوں کہ اردو یونیورسٹی قائم ہو اور جلد قائم ہو۔ مگر اسی کے ساتھ یقین ہے کہ محض مضمون نگاری، مراسلہ بازی اور تجاویز پاس کر دینے سے یونیورسٹی نہیں قائم ہو جائے گی، جد و جہد اور شدید، مسلسل اور پیہم جد و جہد کی ضرورت ہے۔ کئی سال پہلے جب خواجہ احمد فاروقی صاحب کے مراسلوں کے جواب میں میں نے کئی مراسلے لکھے تھے تو اس وقت خواجہ صاحب سے گزارش کی تھی کہ تحتا بحثی سے کوئی فائدہ نہیں، اردو دوستوں اور اردو یونیورسٹی کے حامیوں کا مختصر جلسہ بلایئے اور عملی اقدام کی تجاویز پر غور کر کے کوشش شروع کر دیجئے، ہم سب آپ کی غیر مشروط تائید کریں گے اور جہاں تک ممکن ہو گا مدد بھی کریں گے۔ مگر کئی سال گزر گئے اس سلسلے میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ میری یہی درخواست محترم عباسی صاحب سے بھی ہے۔

جامعہ ملیہ کے ارباب حل و عقد نے اردو یونیورسٹی کے لئے اپنی خدمات پیش کر دی ہیں۔ انھوں نے اس کام کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے، جس نے وزیر تعلیم سے بھی ملاقات کی، جناب گجرال صاحب سے بھی اور گجرال کمیٹی (فروغ اردو کمیٹی) سے بھی۔ جامعہ کو اردو یونیورسٹی کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے وہ اپنی جگہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے جو کچھ کر سکتی ہے کرتی رہے گی، لیکن جو لوگ اردو کی ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے حامی اور موید ہیں، ان کو چاہئے کہ اردو دوستوں سے مشورہ کر کے ایک کمیٹی بنا لیں اور حکومت سے بات شروع کر دیں۔

خوش قسمتی سے دسمبر میں انجمن ترقی اردو کی کل ہند کانفرنس ہونے والی ہے اور ہندوستان کی راجدھانی میں ہو گی، اس موقع پر ملک کے کونے کونے سے بہت بڑی تعداد میں اردو دوست جمع ہونے والے ہیں۔ بڑا اچھا ہو اگر ایک اجلاس اردو یونیورسٹی کے قیام پر غور کرنے کے لئے مخصوص کر دیا جائے اور عملی اقدام کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جائے۔ وہ حالات کا معروضی جائزہ لے کر اور حکومت سے گفتگو کر کے اس سلسلے میں ضروری اقدام کرے۔ مجھے امید ہے کہ میری اس تجویز سے اردو کے تمام حلقوں کو اتفاق ہو گا۔

نئی دہلی۔　　• عبداللطیف اعظمی

میر کے ایک شعر کے مطلب کی وضاحت درکار

میر تقی میر کے مندرجہ ذیل شعر کی وضاحت چاہتا ہوں۔ قارئین "ہماری زبان" سے درخواست ہے کہ اس شعر کا مطلب واضح کریں۔

شعر یہ ہے ؎

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

بمبئی۔　　• رئیس منظر

اخباروں سے تراشے

اترپردیش میں اردو اساتذہ کا حال زار

اگرچہ حکومت نے اردو زبان کے لئے سہولت فراہم کرکے ایک طرف تو اردو زبان کو طاقت بخشی ہے۔ اور اس کی ترقی کے لئے راہ ہموار کی ہے۔ مگر دوسری طرف محکمۂ تعلیم کے بعض متعصب افسران اور بیسک شکشا ادھیکاریوں نے فرقہ وارانہ فضا بھی پیدا کر دی ہے۔ اترپردیش حکومت نے اردو کے لئے جتنی سہولت دی ہے اتنی ہی بعض افسران محکمۂ تعلیم نے رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ اردو اساتذہ کی ابتدائی درجات سے ثانوی درجات تک کی تقرری جو کہ جولائی میں ہی ہونا چاہئے تھی۔ اب تک مکمل نہیں ہو سکی ہے۔ صوبہ کے تقریباً ۵۰ فی صدی اضلاع ایسے ہیں جہاں کے بیسک شکشا ادھیکاری اردو کی ہر اسکیم کو ناکام بنانے کی ہر امکانی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر آگرہ، مظفر نگر، باندہ، بریلی وغیرہ اضلاع کے بیسک شکشا ادھیکاریوں نے اگست و ستمبر تک اردو ٹیچروں کا انٹرویو نہیں کیا تو تقرری کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ کانپور کے ضلع میں مجبور کر کے بار بار انتہائی پریشان کرنے کے بعد تقرریاں شروع کیں جو کہ آج تک مکمل نہیں ہوئی ہیں اور امیدوار بڑی تعداد میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ دوسری طرف شرارت یہ شروع کر دی ہے کہ بغیر کسی نوٹس اطلاع کے اردو ٹیچر کو ان کی ملازمتوں سے نکالنا بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ کہیں پر اردو اساتذہ سے گھنٹی بجانے والے کا کام لیا جاتا ہے۔ کہیں سے اردو ٹیچر کو پیون بک دے کر نگر پالیکا اور بیسک شکشا ادھیکاریوں کے دفتر میں ڈاک بھیجی جاتی ہے۔ اگر اردو اساتذہ کوشش کر کے اردو کے لڑکے اسکولوں میں داخل کراتے ہیں تو اول تو اردو طلبہ کا داخلہ نہیں کیا جاتا ہے اور بدرجہ مجبوری کرنا ہی پڑتا ہے تو ان کے داخلہ فارم میں ان کی مادری زبان ہندی لکھی جاتی ہے۔ غرض کہ صوبہ کی کچھ بیسک ماسٹر صاحبان اردو کے ساتھ تعصب برت کر فرقہ وارانہ فضا پیدا کر رہے ہیں جس کی چھوٹ ہر ضلع بیسک شکشا ادھیکاری پوری طرح سے دیئے ہوئے ہے بلکہ پشت پناہی بھی کرتے ہیں۔ جب کسی قسم کی شکایت ڈپٹی بیسک ڈائرکٹر آف اردو یا بیسک ڈائرکٹر ایجوکیشن سے کی جاتی ہے تو وہاں کوئی سماعت ہی نہیں ہوتی ہے۔ حکومت کو چاہئے اس محکمہ میں ذمہ دار شخص کا تقرر کیا جائے جو کہ اردو سے ہمدردی رکھتے ہوں اور صرف اردو کی اسکیم کو کامیاب بنانے میں خود مختار ہوں اور ساتھ ہی اسکیم کے کامیاب بنانے کے لئے جو مشورہ حکومت ان کو دے اس پر عمل درآمد کرائیں۔

سیاست جدید کانپور

لکھنؤ کے اردو اساتذہ کا ایک جلسہ

لکھنؤ کے اردو اساتذہ کا ایک ہنگامی جلسہ

لکھنؤ میں اردو اساتذہ کو تنخواہ کے ساتھ مہنگائی بھتہ نہ دینے کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے انجمن ترقی اردو کے صوبائی جنرل سکریٹری جناب راحت علی خاں کی صدارت میں ہوا۔ مہنگائی بھتہ دینے کی ہدایت کے باوجود افسران محکمۂ تعلیم نے مہنگائی بھتہ نہیں دیا جب کہ اب تک دوسرے سبھی اساتذہ کو مہنگائی بھتہ مل رہا ہے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ نگر پالیکا کا اسپیشل مہنگائی بھتہ مبلغ ۲۲ روپیہ ماہانہ بھی ان اردو اساتذہ کو نہیں دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک سات رکنی وفد نے آج اردو اکیڈمی کے ذمہ داروں سے ملاقات کر کے انھیں اپنی شکایت سے باخبر کیا۔ میٹنگ میں پاس ایک تجویز میں معلمات کو ابھی تک تنخواہ نہ دئے جانے پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ انھیں اگست ستمبر کی بقایا تنخواہ فوراً دی جائے اور ماہ اکتوبر کی تنخواہ عیدالفطر سے پہلے دینے کا انتظام کیا جائے۔ سیاست جدید کانپور

بہترین اردو طالب علم کے لئے طلائی تمغہ

لکھنؤ۔ سنی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ یونیورسٹی

میں ہر سال اردو کے بہترین طالب علم کو ایک طلائی تمغہ دینے کے سوال پر غور کر رہا ہے۔

بورڈ کے سکریٹری سید رفیع الدین احمد نے یہ بتاتے ہوئے کہا کہ اس وقت ریاست بھر کے مختلف شہروں میں اسکول کالجوں اور مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے تقریباً چار سو طلبہ کو ہر سال دس ہزار روپے کے وظیفے دئے جارہے ہیں۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو کی ترقی کے لیے مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ کی مساعی

بمبئی ۔ داؤد بھائی فضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ نے اردو کی ترقی کے پیش نظر ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی بنام "بورڈ برائے ترقی اردو" زیر صدارت جناب رفیق ذکریا تشکیل دی ہے جس کے سکریٹریز جناب سلطان دیسل، مسز رقیہ دیسل، مسز کے اے غفور، بی سردار جعفری، ایس بی دشنوی، کرشن چندر، جاں نثار اختر، شام کشن نگم، ڈاکٹر ظ انصاری، خلش جعفری اور ایم اکرام الدین ہیں۔ ٹرسٹ نے ایک مشاورتی کمیٹی بھی تشکیل دی جو بورڈ کے تحت کام کرے گی اور اردو شاعروں وادیبوں کی ہمت افزائی کی جائے گی اور دیگر علمی وادبی سرگرمیوں کے علاوہ اردو طلبہ کو جرنلزم کی تربیت بھی دی جائے گی۔

• رہنمائے دکن

(باقی صفحہ ۹ سے آگے)

عہدیداروں کے علاوہ مجلس عاملہ کے ممبران کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

سوسائٹی کے منتخب صدر جناب مقبول احمد لاری نے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو میں سب سے زیادہ نمبر پانے والے کے لئے گولڈ میڈل، احباب پبلشرز لکھنؤ کی جانب سے سید انصار حسین صاحب نے احتشام حسین ایوارڈ کے لیے ایک سال کی رقم دو ہزار روپے اور عابد سہیل صاحب نے ماہنامہ کتاب کی جانب سے سوسائٹی کو اکیاون روپے دینے کا اعلان کیا۔

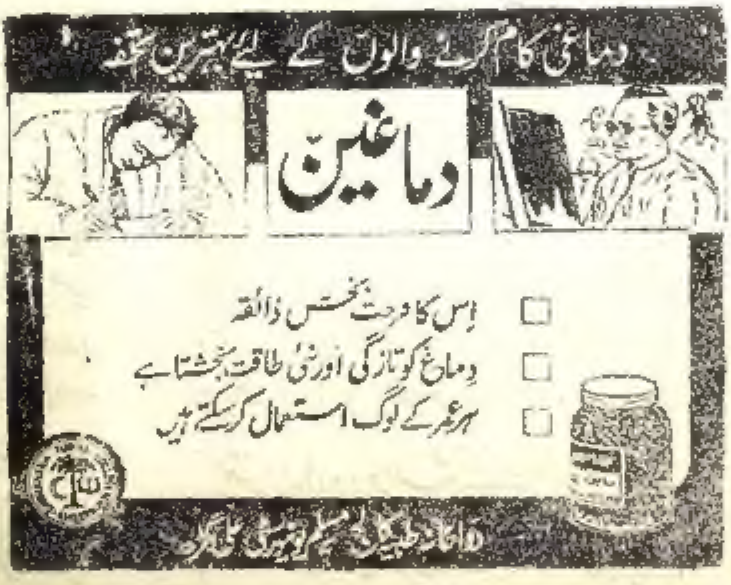
سردار کرم جیت سنگھ جی نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ سوسائٹی کی ریاستی کمیٹی محنت اور تندہی سے کام کرے گی اور احتشام صاحب کے شایان شان یادگار قائم کرنے میں مرکز سے ہر طرح کا تعاون کرے گی انھوں نے مختلف شہروں میں سوسائٹی کی کمیٹیوں کی تشکیل پر بھی زور دیا اور کہا کہ اس سے کام میں آسانی اور تیزی پیدا ہوگی۔ • سکریٹری

بزم یادگار اقبال کی طرف سے گولڈ میڈل

سری نگر: یہاں بزم یادگار اقبال کے بارھویں اجلاس میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے ورکنگ کمیٹی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر یونیورسٹی کے اس طالب علم یا طالبہ کو "بزم یادگار اقبال" کی طرف سے اقبال گولڈ میڈل دیا جائے جو ایم۔ اے اردو میں اوّل آئے اور جس کا خصوصی پرچہ اقبال ہو یا جس نے اقبال پر تحقیقی مقالہ لکھا ہو۔ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

دوسرے جلسے میں جناب ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبال نے جس عالمگیریت کو شعری زبان عطا کی ہے اسے اقبال ہی کے نقطۂ نظر کے مطابق پڑھے لکھے طبقہ تک پہنچایا جائے۔

• محمد یوسف ... شہیدی



دوسرے اداروں کی خبریں

غالب انعامات

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی مجلس انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر سال علمی و ادبی خدمات اور کارناموں کے اعتراف کے طور پر پانچ پانچ ہزار روپے کے دو نقد انعامات تقسیم کئے جائیں۔

انعامات ادبی سرگرمیوں کے مندرجہ ذیل شعبوں میں سے دو پر دئے جائیں گے۔

(۱) شاعری۔ (۲) نثر (صرف ڈراموں اور ناولوں پر)۔ (۳) ہندوستان کے دستور میں تسلیم شدہ زبانوں میں سے بشمولیت انگریزی کسی بھی زبان میں غالب پر بہترین تصنیف پر (۴) ادبی تنقید۔ (۵) اردو اور فارسی میں تحقیقی کام۔

پہلے غالب انعامات ۱۴ر فروری کو دئے جائیں گے۔ پہلے ہر سال کے دونوں انعامات کے لئے ادبی تنقید اور نثر کے میدان میں کسی مصنف کے مجموعی علمی و ادبی کارناموں کو سامنے رکھ کر انعام دینے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

کالجوں اور اسکولوں کیلئے چار انعامات

غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے کالج کے طلبہ و طالبات کو پہلا نقد انعام ایک ہزار روپے اور دوسرا ساڑھے سات سو روپے اور اسکولوں کے طلبہ و طالبات کو پہلا انعام پانچ سو روپے اور دوسرا دو سو پچاس روپے دیا جائے گا۔

یہ انعامات ان طلبہ و طالبات کو ملیں گے جن کے مضامین و مقالے غالب کے متعلق مضمون نویسی کے مقابلے میں اوّل یا دوئم آئیں گے مضامین و مقالے ۱۵ر دسمبر تک ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ کے نام بھیجے جانا چاہئے۔ دیگر معلومات و تفصیلات کے لئے ڈائرکٹر سے رجوع کیا جائے۔

پتہ: ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب ماتا سندری لین۔ ● سید سہروردی

احتشام حسین میموریل سوسائٹی کی طرف سے اردو گولڈ میڈل کا اعلان

لکھنؤ: کل ہند احتشام حسین میموریل سوسائٹی کی ریاستی شاخ کا قیام ۱۰ر اکتوبر کو لاری ہاؤس میں سوسائٹی کے ایک جلسہ میں ہوا جس کی صدارت سابق ریاستی وزیر ڈاکٹر پی، ڈی، کپور اور چیئرمین سردار کرم جیت سنگھ نے کی جلسہ میں شہر کے متعدد دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے شرکت کی۔

صدر جلسہ ڈاکٹر پی، ڈی، کپور نے احتشام میموریل سوسائٹی کی ٹھوس علمی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا "پروفیسر احتشام حسین کی شخصیت اور ان کے احسانات کو دیکھتے ہوئے سوسائٹی کی یادگاری سرگرمیوں کی راہ میں فنڈ کی کمی حائل نہ ہونے دینا چاہئے اور ہم آپ سب مل کر اسے پوری طور پر انجام دیں۔"

ڈاکٹر شارب ردولوی سکریٹری احتشام حسین میموریل سوسائٹی (دہلی) نے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کی یاد تازہ رکھنے کے لئے سوسائٹی کوشاں ہے کہ کم از کم ۲ یونیورسٹیوں میں گولڈ میڈل قائم ہو جائے اور کسی یونیورسٹی میں میموریل لکچر اور احتشام حسین چیئر قائم ہو جائے۔ آل انڈیا ریڈیو سے احتشام حسین میموریل لکچر شروع کئے جانے کے سلسلہ میں وزارت اطلاعات و نشریات میں کوشش کی جا رہی ہے۔ احتشام صاحب کی تصانیف کا تین جلدوں میں انتخاب، بہترین تنقیدی اور تحقیقی کارناموں پر احتشام حسین ایوارڈ اور دوسرے اقدامات بھی سوسائٹی کی علمی خدمات میں شامل ہیں۔

ان تقاریر کے بعد حسب ذیل عہدیداران پر مشتمل ریاستی کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔

چیئرمین جناب مقبول احمد لاری، وائس چیئرمین ڈاکٹر پی، ڈی، کپور، جناب فرحت اللہ انصاری خازن سردار کرم جیت سنگھ اور جنرل سکریٹری جناب خورشید احمد

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

(باقی صفحہ ۱۰ سے آگے)

بھی اسے تخلیق ہی مانتے رہے ہیں۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے بنے بھائی کی نظموں کے بارے میں بھی میں نے اپنے ذہنی تحفظات کا اُن کے سامنے ہی ذکر کر دیا تھا اور بعد میں جدید شعرا کے نثری تجربوں کے متعلق بھی کئی بار اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ بنے بھائی میرے تحفظات و شبہات کو سننے کے باوجود اس بات پر مصر رہے کہ "تم پگھلا نیلم کو توجہ سے پڑھ کر ہی کوئی رائے قائم کرو۔" اور دوسرے ان کے اس تجربے کو مستقبل کا ناقد جو بھی وقعت دے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جدید نثری نظموں سے مزاج کے لحاظ سے مختلف ہونے کے باوجود بھی "پگھلا نیلم" اس تجربہ کا نقطۂ آغاز ہے۔

"پگھلا نیلم" کی تخلیقات کے پیچھے پر رومانیت کی گہری تہ چڑھی ہوئی ہے۔ یہی رومانیت جو ترقی پسند شاعری کا خاصہ تھی اور جو انقلاب اور سماجی مسائل کو بھی رومان کے قالب میں ڈھال دیتی تھی۔ بنے بھائی اس تجربے سے پہلے پابند شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے فیض کے ساتھ زنداں میں اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں بھی لکھی تھیں۔ افسانے سے شاعری تک اُن کے تجربے اُن کے تخلیقی مزاج کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سیاسی کاموں، انتظامی تقریروں اور صحافتی ذمہ داریوں نے انھیں اپنے اسی تخلیقی جوہر کو اس کی وسعتوں تک بروئے کار آنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے باوجود تنقید و نظریہ کے علاوہ اردو کا تخلیقی ادب بھی اُن کے شاعرانہ مزاج کے اُن نقوش کو آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا جو براہ راست ان کے قلم سے یا بالواسطہ دوسرے فنکاروں پر ان کے اثر سے ابھرے اور پنپے۔

اُن کی موت سے برصغیر میں ترقی پسند تحریک ہی اپنے سب سے مخلص قائد اور اہم ترین معمار سے محروم نہیں ہوئی بلکہ اردو ادب اپنے ایک اہم ترین عصری میلان کے نمائندے سے بھی محروم ہو گیا۔ ان کی بالغ تنقیدی نظر، کلاسکیت میں رچا ہوا ان کا نیا ادبی شعور، تہذیب و فنون لطیفہ سے ان کی وسیع واقفیت اور عارفانہ بصیرت برسوں ادب کی راہوں کو اجالتی رہی اور اب بھی ادب و زبان کو نئی روشنیاں دے سکتی تھی۔ ایک وجود کی روشنی کے ساتھ کتنی ہی روشنیاں بجھ گئیں۔ سنا ہے کہ دنیا میں انھیں سب سے زیادہ جو خطہ پسند تھا وہ قزاقستان تھا۔ اسی محبوب خطے کے شہر "الما آتا" میں اردو ذہن و روایت کی اس روشنی نے دنیا سے منہ موڑ لیا جس پر مخالفت و تعصب کے اندھیرے بھی پردہ نہیں ڈال سکتے۔ بنے بھائی اردو تہذیب، اودھ کے آداب و تکلفات، نرم گفتاری، خوش ذوقی اور دردمندی کے ایسے پیکر تھے جس نے کمیونزم کے لیے اپنی مخلصانہ جد و جہد، میدان کارزار کی آتش فشانیوں اور دار و رسن کی آزمائشوں میں بھی ان قابلِ احترام انسانی صفات کو اپنے وجود میں محفوظ رکھا وہ آخر تک اُن اقدار کی پرورش کرتے رہے جن پر ان کا ایمان مستحکم تھا۔

بنے بھائی کی موت کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ چلی میں لاطینی امریکہ کے سب سے بڑے شاعر پبلو نرودا کی موت قتل و غارت، تشدد و بہیمیت کے سفاکانہ اور ظلمت بدوش ماحول میں واقع ہوئی۔ نرودا سے اردو کی ترقی پسند تحریک ہی نے کسب فیض نہیں کیا بلکہ دنیا کے ادب اور شاعری پر بھی اُس نے اپنے منفرد ذہن کے نقوش چھوڑے ہیں۔ بنے بھائی کی طرح وہ بھی کمیونزم، امن تحریک اور ترقی پسندی کا مبلغ و مجاہد تھا۔ دونوں کی عمریں بھی کم و بیش برابر ہی تھیں۔ چلی کی فوجی آمریت کا مستبدانہ ماحول نرودا کے نفسِ گرم کی آنچ برداشت نہ کر سکا اور پاکستان کی منافقت پرست استحصال پر مبنی سیاست سجاد ظہیر کے وجود کو قبول نہ کر سکی۔ سجاد ظہیر کی موت سے خلا کا جو احساس ہوا تھا نرودا کی موت نے اُس احساس کو اور گہرا کر دیا۔ ہمارا موجودہ معاشرہ، جو لوٹ کھسوٹ کرنے والے جنگ کے تاجروں کو زندگی کی لمبی چھوٹ دیتا ہے "انسانیت کی نجات کے قرابان" تخلیقی ذہنوں کے وجود کو زندگی کرنے کی مہلت ہی کب دیتا ہے ؎

منفرد رہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

(صفحہ ۱۳ سے آگے)

اہم ناولٹ ہے جس میں سجاد ظہیر نے جدید مغربی تکنیک کو برتا ہے۔ انھوں نے اپنی اس تخلیقی صلاحیت سے بعد میں کوئی کام نہیں لیا۔ نہ افسانے لکھے، نہ کوئی ناول۔ سیاسی اور تنظیمی مصروفیات نے انھیں مستقل تصانیف کا موقع ہی نہیں دیا۔ "روشنائی" ترقی پسند تحریک کی تاریخ ہے۔ "ذکر حافظ" حافظ کی تفہیم و دفاع، اور "نقوش زنداں" اُن کے مکاتیب کا مجموعہ جس وقت وہ پاکستانی جیلوں میں زندگی کاٹ رہے تھے، میں نے "نقوش زنداں" پڑھی۔ ان خطوط میں جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک بے لوث، ایک اعلیٰ مقصد کے لئے وقف زندگی، ادب و فنون لطیفہ کے عاشق رشتوں اور دوستوں کا احترام کرنے والی جمہور دوست، امن پسند اور خواب پرست انسان کی شخصیت ہے۔ "روشنائی" کے انداز فکر سے کہیں کہیں اختلاف کرنے والوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کتاب میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کے پس منظر اس سے وابستہ افراد اور ادب کے بدلتے ہوئے دھاروں کا ذکر بڑی حد تک معروضی انداز میں کیا ہے۔ جوش کی "یادوں کی برات" میں ہم عصر ہندوستانی ادیب و شاعر اور ترقی پسند تحریک جتنی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، سجاد ظہیر کی کتاب میں یہ سب اتنے ہی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔۔ اس کتاب پر شاید انھیں نظر ثانی کرنے اور بیان کی نوک پلک سنوارنے کا موقع نہیں ملا، جس کی وجہ سے کہیں کہیں نثر ڈھیلی ڈھالی ہو گئی ہے۔ ممکن ہے اسلوب بیان سے زیادہ اُن کی توجہ بیان واقعہ پر ہی رہی ہو۔ واقعاتی پہلو سے "روشنائی" اب تک ترقی پسندی کی سب سے مستند تاریخ ہے۔

۱۹۵۵ء میں بنّے بھائی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی کئی نثری نظمیں سنائیں۔ ان میں سے کچھ نظر سے گزر چکی تھیں۔ اسی ملاقات میں انھوں نے "پگھلا نیلم" ازراہ خلوص مجھے مرحمت فرمایا۔ اردو میں نثری شاعری کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ترقی پسند اور جدید شعرا، سب ہی اس کی کامیابی کے سلسلے میں مشتبہ تھے۔ خود سجاد ظہیر نے کتاب کے فلیپ پر یہ معنی خیز جملے لکھے ہیں:

"میرے بعض دوستوں نے میری چند نظموں کو سن کر جب یہ کہا کہ "سجاد ظہیر نئی قسم کی شاعری کا تجربہ کر رہے ہیں" تو میرے دل کو اس جملے سے بڑی چوٹ لگی۔ تجربہ! یہ تو ویسی ہی بات ہوئی اگر کسی عاشق سے یہ کہا جائے کہ وہ جذبۂ محبت کا تجربہ کر رہا ہے! شاعری انسانیت کا لطیف ترین جوہر ہے۔ اس کے اظہار کو تجربہ کہنا بڑا ظلم ہے۔"

آزاد نظم کے ابتدائی تجربوں کے خلاف سجاد ظہیر نے ہی برسوں بیتے گئے ہوئے ان تجربوں کو انحطاط پسندی قرار دیا تھا۔ وہی سجاد ظہیر اب خود اردو شاعری میں ایک اور جرأت مندانہ تجربے کی بنا ڈالتے ہوئے یہ جملے کہہ رہے تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو بنیادی طور پر "اظہار" سمجھنے لگے تھے۔ ترقی پسندی کے ادعائی اور مقصدی نظریۂ شعر سے اس خیال تک پہنچنے میں انھوں نے جو طویل ذہنی اور تخلیقی سفر کیا، وہ ان کے ادبی ذوق کی پختگی کا ثبوت ہے۔ سنتے وقت اُن کی زبان سے اُن کی نظمیں بہت اچھی لگی تھیں۔ لیکن کاغذ پر پڑھتے ہوئے ان میں وہ آہنگ پیدا کرنا، جو اُن کی آواز اور لہجے سے پیدا ہوتا تھا، مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ ترقی پسند شعرا جن کی طرف سے ان نظموں کے لئے پسندیدگی کا بنّے بھائی نے ذکر کیا ہے، نجی اور بے تکلف گفتگو میں انھیں شاعری ماننے میں تامل کرتے تھے۔ اس طرح کی گفتگو ایک مشہور اور معتبر شاعر سے بہت دلچسپ انداز میں اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ جدید ادب کے ناقدین و مفسرین ان نظموں کو "ادب لطیف" کی نئی شکل سمجھتے اور سمجھتے رہے خود بنّے بھائی اپنے اس تجربے سے مطمئن اور خوش تھے۔ اُس وقت تک جدید شاعری میں نثری تجربے کی رو نہیں چلی تھی، کئی برس بعد بعض جدید شعرا نے نثری آہنگ میں نظمیں لکھنے کے تجربے کئے۔ اس قسم کے تجربے انگریزی کے علاوہ ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں رائج ہو چکے تھے، مگر اردو میں اب تک ان کی حیثیت و نوعیت پر کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔ پتہ نہیں بنّے بھائی جدید شعرا کی نثری نظموں کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کی اور نئے شعرا کی نظموں میں لہجے، اسلوب اور طرز احساس کا بڑا تفاوت ہے، لیکن بنّے بھائی کے لفظوں میں ہے یہ بھی "اظہار" ہی! اس لئے شاید وہ اسے بھی تجربے کے

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

وحید اختر

میرا صفحہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

بنّے بھائی کی دلچسپی ادب تک محدود نہ تھی، وہ رقص، موسیقی، مصوری، بت تراشی تمام فنون سے باذوق شناسائی رکھتے تھے، تاریخ اور آثار قدیمہ پر ان کی نظر عمیق تھی، معاشیات اور سیاسیات کی مارکسی تعبیر کے وہ ماہر تھے۔ وہ عملی سیاست میں بھی برسوں رہے، مگر ان کا اصل میدان کمیونسٹ پارٹی میں بھی تہذیبی اور ادبی محاذ ہی تھا۔ ہندوستان میں امن تحریک کے وہ ایک سرکردہ رہنما تھے۔ اپنے خاندانی اثرات، علم اور شخصی وجاہت کی بنا پر وہ بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایک بار جس نظریے اور پارٹی سے رشتہ جوڑا اُسے آخری سانس تک نبھایا۔ اپنے خوشحال اور بارسوخ قریبی عزیزوں اور دوستوں کے درمیان وہ درویشی کی آن بان سے رہے۔ اکثر ان کی جیب تہی ہوتی تھی۔ انھوں نے مجھ سے بارہا اصرار کیا کہ جب بھی دلی آؤ، شام میرے یہاں گزارا کرو۔ ایک بار کے علاوہ کبھی مجھے اُن کے گھر جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ اُن سے آخری ملاقات مئی میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسوں کے موقع پر ہوئی، وہی سراپا خلوص و شفقت شخصیت، وہی شعر سننے پر اصرار، وہی ادبی اختلافات کو مسکراہٹ کے ساتھ ختم کر دینے کا انداز۔ اس سے کچھ دن پہلے وہ جامعہ اردو کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھنے آئے تھے۔ کئی گھنٹے ساتھ رہا۔ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس سے اپنا سامان لیتے وقت انھوں نے چار آنے کسی دوست سے مانگ کر ایک بیرے کا قرض ادا کیا۔ دوسرے لمحے مجھ سے کہا کہ اب کی دلی آؤ تو میرے گھر ضرور آنا۔ میں نے کہا آپ کے یہاں آنے کے لیے ٹیکسی کا بل کون دے گا؟ کہا "میں دوں گا"۔ میں نے کہا "آپ کے پاس تو کبھی کبھی چار آنے نہیں رہتے"، اگر اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تو کیا ہوگا؟ ہنس کر کہنے لگے "ایسا ہوا تو تم ہی سے قرض لے کر بل ادا کر دوں گا۔"

لیکن میری بے توفیقی کہ اُن کی اس پیش کش سے بھی میں فائدہ نہ اٹھا سکا۔

بنّے بھائی اردو ادب میں اپنے "انگارے" کے افسانوں سے روشناس ہوئے۔ اس کے بعد ان کا ناولٹ "لندن کی ایک رات" شائع ہوا۔ بنّے بھائی نے ایک بار حیدرآباد میں مجھ سے میرے فلسفے اور نفسیات کے استاد پروفیسر صلاح الدین کا حال پوچھا اور اُن سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ لندن میں دونوں کا برسوں ساتھ رہا تھا۔ بنّے بھائی نے اسی وقت یہ انکشاف بھی کیا کہ ان کے ناول کے ہیرو نعیم درحقیقت صلاح الدین صاحب ہی ہیں۔ صلاح الدین صاحب کی شخصیت بذات خود بڑی پرکشش تھی، وہ اپنے زمانے کے ذہین ترین طلبہ میں سے تھے، جامعہ عثمانیہ سے گریجویٹوں کی جو پہلی کھیپ نکلی، وہ اس میں نمایاں تھے۔ ڈھاکے سے انھوں نے ایم۔ اے کیا اور ریسرچ کے لئے لندن چلے گئے۔ وہاں برسوں رہے مگر اپنی ذہانت اور بے انتہا مطالعے کے باوجود جیسے گئے تھے، ویسے ہی واپس آئے۔ کچھ دن عثمانیہ میں انگریزی پڑھاتے رہے، پھر فلسفے میں لکچرر ہوگئے۔ جب میں نے ان سے پڑھا، وہ ریڈر تھے اور ریٹائرمنٹ کے قریب۔ ان کے ایسے استاد، جو اپنے آپ میں گم رہنے کے باوجود اپنے مضمون سے پورا انصاف کر سکتے ہوں، میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ ان کے مطالعے کی وسعت کی غمّاز اُن کی ذاتی لائبریری تھی۔ ایک بار میں نے اُن کی لائبریری پر رشک کیا تو حسرت سے فرمایا "میاں برسوں پہلے اِن کتابوں کے جمع کرنے پر میں نے تیس چالیس ہزار روپے صرف کئے ہیں، یہ کتابیں کس کام کی؟ اگر اتنی ہی مالیت کی کوئی جائداد خرید لیتا تو آج وہ لاکھوں کی ہوتی، کتابیں تو کوڑیوں کے مول بکتی ہیں۔" بنّے بھائی کے وسیلے سے صلاح الدین صاحب کی طالب علمی کے زمانے کی شخصیت منکشف ہوئی تو اُن کی قدر دل میں اور بڑھ گئی۔ وہ خدا کے فضل سے ابھی بقید حیات ہیں، اور چند برس قبل تک ریٹائرمنٹ کے باوجود پرائیویٹ کالجوں میں اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

"لندن کی ایک رات" شاید اردو کا پہلا

(باقی صفحہ [illegible] پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) مطبوعہ و ناشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علیگڑھ میں چھپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا